فخر المحدثین، شگفتہ خطیب

حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ

حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ علم وعمل اور فکر وادب کی نمائندہ شخصیت تھے، ان کا وجود باعث فخر تھا، تمام علمی محفلوں ومجلسوں میں ان کی دلآویز شخصیت ناظرین کا من موہ لیتی تھی اور ہر جگہ وہ اپنی خوشگوار انفرادیت کے پیکر تراشتے تھے، وہ قلم کے بادشاہ تھے اور شگفتہ نثر لکھتے تھے البیلے اسلوب اور منفرد لب ولہجہ میں کوثر وتسنیم میں ڈھلی ہوئی ان کی باوزن تحریریں اور نگارشات باذوق قارئین کو سیراب کرتی رہیں گی، شاہ جیؒ نے تحریر وانشاء میں نئی جہتیں پیدا کیں وہ یکتائے روزگار صاحب قلم تھے، خشک سے خشک تر مضمون کو بھی انہوں نے شادابی سے بغل گیر کردیا اور قاری کو مسحور کردیا وہ خوش فکر اور پاکیزہ خیال کے عالم دین تھے، ان کی تحریر وتقریر میں جا بجا اس کا احساس ہوتا ہے، گذشتہ نصف صدی سے زائد مدت سے لکھنا پڑھنا ان کا بچھونا تھا اور اس کے بغیر انہیں قرار نہ تھا، زندگی کے کسی بھی حادثہ نے ان کے اس عمل کو متاثر نہ ہونے دیا، حتی کہ جاتے جاتے اپنے علمی وتحقیقی مجلہ ”محدث عصر“ کا اداریہ بھی املاء کراگئے، قومی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نظر تھی، عالم اسلام کی زبوں حالی پر بہت کڑھتے تھے اور اپنی فکر مندی کا اظہار بھی کرتے، مگر جذباتی نعروں کے بجائے تعمیری کردار ان کا شیوہ رہا، حضرت شاہ صاحبؒ کی زندگی بے شمار خوبیوں سے عبارت ہے وہ عظیم باپ کے عظیم بیٹے تھے، ان کے نامور والد حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ اپنے زمانہ کے لاثانی محدث تھے اگر اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بغداد کے جامعہ نظامیہ نے غزالی جیسے باتوفیق طالب علم کو امام غزالی بنایا تو بلا ریب دارالعلوم دیوبند

نے بھی مولانا انورشاہ کشمیریؒ جیسا بے مثال محدث پیدا کیا، دارالعلوم نے اپنے قیام کے بعد شبلی وجنید جیسے علم وعمل اور فضل وکمال کے پیکر تراشے، دارالعلوم کے انہی ارباب فضل وکمال کی موجودگی میں مولانا سید انظر شاہؒ نے آنکھیں کھولیں، ابھی چار سال کے تھے کہ والدگرامی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور شاہ صاحبؒ کو یتیمی کے داغ سے دوچار ہونا پڑا، کفالت کے اسباب بہ ظاہر ندارد تھے، ان کے والد مرحوم نے ہونہار اور فخر روزگار شاگردوں کی ایک جماعت تیار کی تھی ان میں شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب اور شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی جیسے مربی ورہنما آپ کو مل گئے، بالخصوص شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی نے آپ کی شخصیت سازی میں نمایاں فریضہ انجام دیا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی جو علم وادب کا مرکز تھا، مفسر قرآن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی سرپرستی بھی نصیب ہوئی، جدید علوم کی طرف رجحان غالب تھا، اس لئے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لے کر مختلف امتحانات پاس کئے، انہیں دنوں ہند پاک کے بٹوارے کو لے کر فسادات ہوئے تو شاہ صاحب دیوبند واپس آگئے اور پھر دارالعلوم دیوبند سے عالمیت کی تعلیم حاصل کی اور امتیازی نمبرات سے کامیاب قرار پائے، ابتدائی ہی سے نہایت ذہین وفطین اور بے پناہ قوت یادداشت کے مالک تھے اپنے قابل رشک حافظہ کی بنیاد پر انہوں نے علوم الحدیث والقرآن کو بڑی حد تک مستحضر کرلیا تھا، اکابر دارالعلوم کے علمی ورثہ کے وہ دائرۃ المعارف تھے، انہیں حضرت تھانویؒ کے افادات وواقعات زبان زد تھے اس لئے جب بھی وہ گفتگو کرتے تو مجلس کو حضرت تھانویؒ کے واقعات ولطائف سے زعفران زار بنادیتے، عوام وخواص کو مقتضی حال کی رعایت کرتے ہوئے اپنے جادوئی بیان کا اسیر بنا کر چھوڑتے، ان کے علمی دبدبے کی دھاک معاندین کے دلوں پر بھی بیٹھی ہوئی تھی، اس کے باوجود تفاخر وتعلّی سے شدید نفرت رہی اور دوسروں

کے ساتھ نہایت ادب وخندہ پیشانی سے ملتے اور اجنبیت کا احساس تک نہ ہونے دیتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ بڑے باپ کے بیٹے ضرور تھے اور بلاشبہ عظیم نسبت کے مالک تھے مگر انہوں نے اپنا میدان خود ہی بنایا مسلسل کوشش ومحنت کر کے علوم انوری کو سمیٹا اور والد گرامی کا نام زندہ رکھ کر خود بھی فخر خاندان بنے۔

شاہ جیؒ کے تذکرہ جمیل کے لئے قلم وکاغذ کا ایک دفتر چاہئے وہ شش جہت شخصیت کے مالک تھے ارباب فکروادب اور اہل قلم ان کی علمی، تحقیقی اور سماجی خدمات پر لکھیں گے، ان کے تعلیمی، تدریسی فکری اور سیاسی رجحانات کا شرح وبسط سے جائزہ لیں گے تو علم وتحقیق کا ایک انسائیکلو پیڈیا تیار ہوگا اور بلاشبہ یہ ایک فریضے کی ادائیگی بھی ہوگی۔

شاہ صاحبؒ اپنے بے پناہ قوت حافظہ وسعت مطالعہ اور رسوخ فی العلم کی وجہ سے مرجع علماء تھے طلبۂ حدیث اساتذہ مدارس علم وادب سے دلچسپی اور وابستگی رکھنے والے باکمال اشخاص بھی ان کے اردگرد پروانہ وار جمع رہتے، حتی الامکان ان سے بھرپور استفادہ کے مشتاق رہتے اور بامراد ہوکر لوٹتے خود شاہ صاحب افادہ واستفادہ کی تلاش میں رہتے، راقم الحروف کا مشاہدہ ہے ابھی چند سال پیشتر مشہور گہوارۂ علم وادب ندوۃ العلماء لکھنؤ کے سابق معتمد تعلیمات اور متعدد کتابوں کے مصنف مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی مرحوم دارالعلوم دیوبند تشریف لائے انہوں نے اپنے دورۂ دارالعلوم کو صیغۂ راز میں رکھا وہ بہت جلد یہاں سے رخصت ہوا چاہتے تھے کہ چند بنگلہ دیشی طلبہ نے جو ندوہ سے فراغت کے بعد یہاں دورۂ حدیث پڑھنے کیلئے رہائش پذیر تھے حضرت شاہ صاحبؒ کو ان کی آمد سے مطلع کردیا، شاہ جیؒ نے فوراً مولانا ندوی مرحوم کو بلوا بھیجا اپنے گھر بیت الحکمت میں ان کا والہانہ استقبال کیا اور پرتکلف ناشتہ تیار کرایا دونوں کے مابین علمی تبادلہ خیال ہوا قرآنی علوم گفتگو کا موضوع تھا، شاہ جیؒ نے مولانا ندوی کے استفسار پر ایسے

نکات اور رموز واسرار پر روشنی ڈالی کہ موقر مہمان بھی عش عش کرنے لگے، بعد میں مولانا عبداللہ عباس ندوی نے تعمیر حیات میں اپنی روداد سفر تحریر فرمائی تو اس علمی ملاقات کا بطو رخاص تذکرہ کیا، اغلباً ان دونوں بزرگوں کی یہ پہلی بالمشافہ ملاقات تھی، حضرت شاہ جیؒ مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے، بسا اوقات ایسے جملے ادا کرجاتے کہ مجلس زعفران زار ہوجایا کرتی تھی اور اہل مجلس لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے، وہ بڑے ظرافت پسند تھے جس کا مشاہدہ جابجا ہوتا، زبان میں چاشنی اور حلاوت ہوتی بولتے کیا بس رس گھولتے تھے ،خود بھی ہنستے دوسروں کو بھی ہنساتے ، باتوں ہی باتوں میں بہت دلچسپ واقعات بیان کردیتے، ان کی مجلس کے حاضر باش کبھی بھی مایوسی یا پژمردہ نہ ہوتے ، بلکہ ہر لحظہ تبسم اور مسکراہٹ سے صدر مجلس کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتے ،ان کی مجلس میں دینی وسیاسی ذہن رکھنے والے ہر قسم کے لوگ ہوتے اسی لئے آپ ایسا موضوع اختیار فرماتے کہ ہر ایک کیلئے یکساں طور پر مفید ہوتا۔

حضرت شاہ جیؒ سلطان القلم تو تھے ہی لیکن اس سے کہیں زیادہ خطابت کے میدان میں ان کا سکہ چلتا تھا، ماضی قریب کے جن علماء نے اس میدان میں اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور خطابت میں نئی سمتیں پیدا کیں ان میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ،مولانا حبیب الرحمن لدھیانویؒ،مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ،سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ،حکیم الاسلام قاری محمد طیبؒ اور مولانا منظور نعمانی سرفہرست بلکہ اس میدان کے شہسوار رہے ہیں، ہمارے شاہ صاحبؒ نے ان حضرات کو گویا اپنے اندر سمولیا تھا بڑے پیارے انداز واسلوب میں وہ تقریر فرماتے اور اپنے خطاب کا جادو جگاتے تھے، گھنٹوں گھنٹوں تقریر کرتے اور سامعین کو معلومات بہم پہنچاتے

کاتب الحروف نے اپنے دیوبند کے ۹ رسالہ مدت قیام میں ان کو خوب سنا یہاں تک کہ علمی وادبی فضاء میں ان کی زبان وبیان کی شہرت آفتاب نصف النہار پر تھی، صرف دیوبند ہی نہیں اس وقت سرزمین ہند پران کے قدکا کوئی خطیب نہیں تھا، کوئی بھی موضوع ہوتا وہ بالکل پریشان نہ ہوتے، گویا تمام مضامین انہیں ازبر تھے، چند سال ہوئے جناب حامد تحسین دیوبندی کی کتاب پتھر کی کہانی کا رسم اجرا آپ نے فرمایا تو پتھر کی پوری تاریخ بیان کرڈالی، اور افادات کا ایک سمندر انڈیل دیا، ایسے مواقع پر شاہ صاحبؒ آتش جوالہ بن جاتے، مجمع زیادہ ہوتا تو ان کے خطیبانہ تیور اور بدل جاتے، زبان نہایت فصیح وبلیغ استعمال کرتے، فصاحت وبلاغت کے آب شاران پر جانثار بلکہ شاعر کی زبان میں تھوڑی سی ترمیم کی معذرت کے ساتھ کہ:

فصاحت جھومتی تھی ان کے اندازِ تکلم پر   لب اعجاز پران کی بلاغت ناز کرتی تھی

زمیندار کے مدیر اور شاعر ظفر علی خاں مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کا جادوئی اور اپنی رو میں بہالیجانے والا بیان سن لیتے تو برجستہ یہ کہنے پر مجبور ہوتے کہ:

بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں

افسوس! شاہ جی کی رحلت کے بعد فن خطابت جو انہی کی ذات کا حصہ تھا اپنی انتہاء کو پہنچ گیا اور خطابت کے ایک زریں عہد کا خاتمہ ہوگیا۔

یوں تو ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

مقرر اور خطیب بہت سے مل جائیں گے مگر شاہ صاحبؒ جیسا سحر انگیز اور منفرد لب ولہجہ کا مقرر اب کہاں، تدریسی حلقے بھی قائم ہوں گے، علمی وادبی نشستیں بھی منعقد ہوں گی، جلسے جلوس بھی ہوں گے مگر شاہ جیؒ کی عدم موجودگی محفلوں کو بے رونق اور آنکھوں کو اشک بار

کرتی رہے گی

ع

حیف! ہے وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

شاہ صاحبؒ جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ خیر کے اتنے کام انجام پاتے ہیں کہ عقلیں حیران رہ جاتی ہیں، بڑے بڑے تحقیقاتی ادارے، علمی اکیڈمیاں اور ہزار ہا افراد وہ خدمت انجام نہیں دے سکتے جو اللہ تعالیٰ اپنے بعض مخلص اور منتخب بندوں سے کرالیتے ہیں، الحمدللہ تحریک دیوبند اس کی زندہ اور روشن مثال ہے، اس کے بانی ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد واقعی دین اسلام کے بے لوث خادم اور سچے سپاہی تھے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ، امام المحدثین مولانا انور شاہ کشمیریؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے اساطین علم و فضل اس تحریک کی سنہری کڑیاں ہیں، دارالعلوم دیوبند کی یہ خوش نصیبی رہی کہ شریعت محمدی کے فروغ اور تحفظ کو اس نے اپنا موضوع اور مقصد بنایا، شمع رسالت کے پروانے تیار کئے اور آج وہ اسی سمت میں محوِ سفر ہے، دشمنان اسلام کی انڈر گراؤنڈ اسکیمیں اور اپنوں کی بے پناہ عداوتوں نے اسے راہ مستقیم سے ہٹانے کی حتی الامکان کوششیں کیں مگر اس کے پایہ استقامت میں کوئی رعشہ دیکھنے میں نہیں آیا، دارالعلوم دیوبند نے یہی پیغام اپنے فرزندوں کو دیا، شاہ جیؒ بھی دارالعلوم کے ایک فرزند تھے، وہ زندگی بھر فکر قاسمی کے نقیب و ترجمان رہے، ان کے فکر میں جمود نہیں تھا وہ نہایت روشن خیال، خوش فکر اور وسیع النظر عالم تھے، زبان اور قلم دونوں کو اشاعت دین اور دفاع عن الحق کے لئے استعمال کیا، تقریراً دو درجن عربی و اردو کتابیں ان کے گہربار قلم سے نکلیں جس سے علم و ادب میں خوشگوار اضافہ ہوا، پھر ہزاروں کی تعداد میں ان کے کامیاب شاگرد خدمت دین میں مصروف کار ہیں، دارالعلوم

دیوبند میں وہ محدث ہونے کے علاوہ تعلیمات اور دوسرے شعبوں کے ذمے دار رہے، دارالعلوم کی تقسیم کے بعد وہ دارالعلوم وقف کے بانیین میں شمار ہوئے اور وہاں تعلیمات وصدر مدرسی کے فرائض انجام دے رہے تھے، بخاری شریف کا کچھ حصہ ہمیشہ انہی کے پاس رہا، دارالعلوم وقف کو انہوں نے اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کی ہمہ جہت ترقی کیلئے کوشاں رہے، شاہ صاحبؒ قدیم صالحیت اور جدید نافعیت کے قائل تھے، عصر حاضر میں پیدا شدہ احوال سے انہوں نے آنکھیں نہیں موندیں، بلکہ چشم کشا اور نباض وقت ہونے کا احساس دلایا، عصری تقاضوں کے پیش نظر نیز اپنے والد گرامی کے علمی وادبی شہ پاروں کو منصہ شہود پر لانے کی غرض سے جامعۃ الامام محمد انور کی داغ بیل ڈالی اور اہل علم کو بھی ادھر متوجہ فرمایا، آج ان کا لگایا ہوا یہ شجرہ طوبیٰ برگ وبار سمیت پھل پھول رہا ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی رحلت کے بعد اب ذہن کی اسکرین پر ان کی تصویر آتی ہے تو ان کی بہت سی یادوں کے چراغ جل اٹھتے ہیں، ان کی موت موت العالم کی مصداق ہے، ان کے انتقال سے دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم وقف دیوبند اور جامعہ انور کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ طلباء پر تو وہ زیادہ ہی شفیق تھے اور ان کے مستقبل کی زلفوں کے سنوارنے میں آگے آگے رہتے، ۲۰۰۱ء میں جب انہیں صدر جمہوریہ اے پی جے عبدالکلام نے صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا تو خاکسار نے ان کی علمی خدمات پر ایک مضمون قلم بند کیا، جو مختلف رسائل کے علاوہ ماہنامہ محدث عصر نے بھی شائع کیا، حضرت شاہ صاحبؒ نے جیسے ہی ملاحظہ فرمایا تو دارالعلوم دیوبند کے استاذ جناب مولانا خضر محمد کشمیری حفظہ اللہ سے راقم کی بابت معلوم کیا اور دعائیں دیں، احقر ان کا باضابطہ شاگرد تو نہیں ہے مگر ان کے چند اسباق سننے کی توفیق ہوئی، حدیث کی تفہیم وتشریح پر ایسا جامع کلام کہ طبیعت خوش ہو جاتی، دوران سبق علامہ کشمیریؒ، مولانا مدنیؒ، ابن حجر عسقلانیؒ، ابن تیمیہ اور ابن القیم وغیرہم کی آراء

سامنے لاتے، ہر رطب و یابس کو بیان کرنے سے وہ کوسوں دور رہتے۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، بچپن سے قوت یادداشت کی دولت پائی تھی، تین چار سال کی عمر بھی کوئی عمر مگر تمام تر باتیں انہیں یاد تھیں، ابھی تقریباً ۲۵ / ۳۰ روز قبل جب کہ انہیں افاقہ تھا۔ بندہ ناچیز ان کے دولت کدہ پر حاضر ہوا علیک سلیک کے بعد محترم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ کھجناور ضلع سہارنپور سے تعلق رکھتے ہیں، شاہ صاحبؒ فوراً ماضی کے اوراق میں گم ہو گئے اور بولے کہ میں چار سال کی عمر میں فلاں باجی سے ملنے کھجناور گیا تھا ایسا یاد پڑتا ہے کہ وہاں کی آبادی نشیب و فراز اور غیر ہموار زمین میں پھیلی ہوئی تھی، کیا اب بھی ایسا ہی ہے، احقر نے اثبات میں جواب دیا۔

ان کی اس حیرت انگیز یادداشت کی پختگی سے میرے استعجاب کی انتہا نہ رہی، واقعی دنیا اس طرح کے مثالی لوگوں سے اب محروم ہو رہی ہے، شاعر نے بڑے پتے کی بات کہی کہ:

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں — کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

شاہ صاحبؒ کی ظاہری عملی زندگی جتنی پر کشش تھی اور وہ حقوق العباد کی ادائیگی کے لئے جتنے توانا تھے اس سے کہیں زیادہ انہوں نے اپنی باطنی کیفیات کو جلا بخشی، مگر کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہوئی، انہوں نے سلوک و احسان پر نظر رکھی اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ نیز حضرت مولانا محمد انوری لائلپوریؒ سے بھر پور استفادہ کیا، وہ اکابر دارالعلوم کی آخری یادگار تھے، اللہ انہیں اپنے شایان شان رحمت و مغفرت کے سائبان عطا کرے اور ان کے زلات سے درگذر فرمائے، آمین۔

زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا — تم ہی سو گئے داستاں کہتے کہتے

(یہ مضمون ماہنامہ ''ترجمان دیوبند'' بابتہ ماہ جون ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا)

حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کا

نثری بیانیہ

احقر کاتب الحروف کے مطالعہ کی میز پر یکتائے روزگار محدث اور سحر طراز نثر نگار مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیریؒ (متوفی ۲۶ر اپریل ۲۰۰۸ء) کے شاداب قلم فیض رقم کی مرہون سر دست دو کتابیں لالہ وگل اور نقش دوام پیش نظر ہیں، جن کی افادیت کا جادو گردشِ شام وسحر اور مرورِ ایام کے باوصف سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اول الذکر کتاب کے مشمولات ان زائد از ساٹھ کاروانِ دین ودانش کا تذکرہ جمیل ہے جن کے پڑھنے اور سننے سے خزاں رسیدہ چمن میں بہارِ نوعود کر آتی ہے اور گلشن حیات کا پتہ پتہ مسکرانے لگتا ہے، ان اصحاب تذکرہ افراد میں دین وادب، دانش وآگہی، تہذیب وثقافت اور سیاست وسماج کی وہ نمائندہ نامی گرامی ہستیاں بھی ہیں جن کے مختصر سے وجود میں خلاق عالم نے اپنے جواہر وحکم کے بے شمار خزانے ودیعت فرمادئے تھے، ان عزت مآب نفوس کی حکایات ہستی کو مولانا سید انظر شاہ کشمیری نے تحریر وانشاء کے ایسے دل آویز قالب میں ڈھال دیا ہے کہ اب دیر اور دور تک ان کے زندہ وتابندہ رہنے کی قوی تر امید ہے۔

جبکہ مؤخر الذکر کتاب مصنفِ باکمال کے شہرت پذیر والد گرامی امام العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے سوانح، علمی وعملی رجحانات، سیاسی افکار وخیالات، دینی نظریات اور تحقیقات وتفردات کا ایسا حسین شاہ کار ہے کہ اس کی دستاویزی واستنادی

حیثیت اصحاب لوح وقلم کے نزدیک مسلم الثبوت ہے، ۶۲۴ رصفحات پر حاوی نقش دوام کا یہ متذکرہ ایڈیشن صاحب سوانح کی شخصیت کا بہترین سراپا ہے جو محض ایک روایتی سوانح حیات نہیں بلکہ امام العصر علامہ کشمیریؒ کی مختلف النوع کرشماتی شخصیت کا بہترین آئینہ ہے، اس آئینہ کی وساطت سے ہم ان کے شخصی، علمی، فکری، تحقیقی اور سماجی جغرافیہ سے نہ صرف آشنا ہوسکتے ہیں بلکہ ان کی تابناک زندگی سے اسرار حیات بھی معلوم کر سکتے ہیں اور بلاشبہ یہی وہ رموز واسرار ہوتے ہیں جو زندہ قوموں کو فلاح وترقی کی معراج کراتے ہیں، جہاں پہنچ کر حضرت انسان کبر ونخوت کا شکار نہیں ہوتا بلکہ اسرار خودی وخودشناسی اسے خدا شناس بنادیتے ہیں، تا آنکہ وہ علم ومعرفت کی دولت گرانمایہ سے فی الحقیقت ہم عناں بھی ہوتا ہے اور مومنانہ صفات اس کی طرف اس طرح لپکتی ہیں جیسے مقناطیس آہن پاروں کی جانب۔

چنانچہ مذکورہ ہر دو کتب سیرت وسوانح اور افکار وآثار کا حسین مرقع ہیں۔ جن کے جملہ مضامین آمد کا نتیجہ ہیں۔ آورد کا کہیں بھی اور کبھی بھی بالکل احساس نہیں ہوتا۔ مولانا کشمیری کے رشحات قلم ان کے دل کی تراوش ہے، جو حق وصداقت کا خوبصورت اعلامیہ ہے۔ ان میں جوش ہے، ابال ہے، حرکت وفعالیت ہے، غیرت وحمیت کی للکار ہے، جذبۂ اندرون کی حسین صدائیں ہیں، سمندر کی گہرائی اور صحرا کا سکون ہے، گفتار ورفتار میں نرمی بھی ہے اور سبک خرامی بھی، شعلہ بھی ہے اور شبنم بھی، اظہار حقیقت بھی ہے اور دیانت کا اعتراف بھی، فاضل مصنف اپنے ممدوحین کے دلگداز قصیدے سناتے ہیں لیکن بے سروپا نہیں، عقیدت والفت کا اظہار کرتے ہیں مگر حد اعتدال سے نہیں ہٹتے، زبان وبیان میں بڑی ندرت ہے، جملوں کی تراش خراش اور انتخاب تعبیرات میں ید طولیٰ حاصل ہے، لگتا ہے کہ جملوں کا برمحل شتابی استعمال مولانا مرحوم کا وصف خاص تھا۔ وہ بے تکلف لکھتے بھی اور املا بھی کراتے، یہی بے تکلف استعمال مذکورہ کتابوں میں مکمل طور پر موجود ہے جس

سے مطالعہ کی لذت دوآتشہ ہوگئی ہے اور قاری کی شکم سیری بلکہ علم پروری کا بھرپور سامان بھی۔ ہر کتاب کی ہر سطر فاضل قلم کار کے ذوق جمال وحسن اظہار کی شہادت دیتی ہے۔

عہد حاضر کے نامور نقاد حقانی القاسمی کا شاہ جی کے نثری ادب کے سلسلہ میں بطور شہادت ذیل کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے!

''انظر شاہ کشمیری کی نثر میں طلسمی کیفیت ہے، اردو میں ایسی پردم اور بلند آہنگ نثر لکھنے والے کم ہیں، جن کے جملوں کے زیر وبم اور موسیقیت سے وہ اذہان بھی متاثر ہوتے ہیں جو لفظوں کے معانی ومفاہیم تک رسائی سے قاصر رہتے ہیں، ان کی نثر کی رمزیت اور اسراریت میں وہ کیفیت ہے کہ قاری اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا، اور اس کا ذہنی وجود نثر کی موج رواں میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے''۔ (دارالعلوم دیوبند کا ادبی شناخت نامہ، ص:۷۸-۷۹)

حضرت شاہ صاحبؒ کے زرخیز حافظہ، وسیع مطالعہ، قوی مشاہدہ، مستحکم طرز استدلال، مدلل ومبرہن کلام اور شگفتہ انداز بیان نے ایسا مواد فراہم کیا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی، ہل من مزید کی صدائیں بلند ہوتی مسموع پڑتی ہیں، شاہ جیؒ کی تحریریں ان کے بلند تخیل کی پیداوار ہیں۔ وہ قادر الکلام نثر نگار اور زور آور انشاء پرداز تھے۔ ان کی ابحاث علمی بھی ہیں، تحقیقی بھی ہیں اور سوانحی بھی۔ جس موضوع پر چاہتے ہیں دلائل وبراہین کے انبار لگادیتے ہیں، انہیں نہ تکان ہوتی اور نہ افسردگی کا احساس، ہمہ وقت ان کا خیال بلندیوں کو چھونے، آفاقیت کو سمیٹنے اور مسائل لاینحل سے نپٹنے کا رہتا ہے جس کا ادراک مذکورہ کتب سے بھی ہوتا ہے۔ حقائق کو واشگاف کرنا، دقائق کو بیان کرنا اور واقعات ونوازل سے صحیح نتائج کا استخراج ان کا وجدانی پہلو ہے جس میں ان کی جمالیاتی حس اور ذکاوت وموزونیت کا بڑا دخل ہے۔ وہ مسائل وحوادث سے الجھتے ہی نہیں بلکہ تریاق بھی

فرماتے ہیں۔حضرت شاہ صاحب کی نثر نگاری وانشاء پردازی کی تفہیم وتشریح بھی دراصل انہی لوگوں کے بس کی بات ہے جو بذات خود اچھے نثر نگار اور صاحب فن ہوں، یہ تہی دامن اور کوتاہ قلم کیا عرض کرتا لیکن تعمیل ارشاد اور خیال خاطر اکابر کے مدنظر یہ چند بے ربط سطور صفحۂ قرطاس پر منتقل کر رہا ہے جس سے بحیثیت نثر نگار انظر شاسی کا تحرک پیدا ہوسکتا ہے، علی الخصوص اس لئے بھی کہ آپ کے یہاں طرز تحریر اور نثر وانشا نگاری میں تخلیقیت کا بے پناہ وفور ہے، علمی خانوادے کے چشم وچراغ اور نامور والد کے سعید بیٹے تو تھے ہی اس پر مستزاد شروع ہی سے لکھنے لکھانے کا معمول و بے پناہ جذبہ، چنانچہ معروف ادیب اور ممتاز صاحب قلم مولانا مناظر حسن گیلانیؒ آپ کے ایک خط کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں:

''ہر شخص کے رجحان، افتادِ طبع، اس کی اندرونی صلاحیتوں کی نوعیت کو معلوم کرنے کیلئے صرف چند سطریں ارباب نظر کے نزدیک کافی ہوتی ہیں، خاکسار نے آپ کی کوئی مستقل تحریر تو نہیں دیکھی ہے، صرف متعدد مکاتیب ہی سے سرفراز ہوا ہوں، لیکن ان خطوط میں بھی جو میں نے پایا ہے اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ''اسلام'' کی خدمت قلم کی راہ سے ان شاء اللہ آپ آئندہ کریں گے اس کی توفیق آپ کو بخشی جائے گی اور گو چھوٹا منھ بڑی بات ہے لیکن کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں کشمیر کے سادات کے ایک خانوادے کو خصوصی اہمیت حاصل ہونے والی ہے'' (لالہ وگل ص ۱۰۰)۔

ملک کے ایک مایۂ ناز اہل علم وقلم کی یہ پیشن گوئی بلکہ شہادت اس زمانہ کی ہے جب آپ کے قلمی سفر کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ پھر رب دوجہاں نے وہ دن بھی دکھایا کہ آپنے حضرت علامہ کشمیریؒ کے نام اور کام کو آگے بڑھایا اور اپنے معاصرین میں انفرادیت کے چراغ روشن کئے، زبان وقلم کی راہ سے آپ کی وقیع خدمات آب زلال سے مرقوم ہوں گی

اور وقت کا مؤرخ ان کارہائے نمایاں سے صرف نظر نہ کر سکے گا۔

خیر یہ گفتگو تو بطور جملہ معترضہ کے تھی۔ اصل بات نقش دوام اور لالہ وگل کے محتویات و مشتملات کے تعلق سے چل رہی تھی کہ شاہ صاحب کے تحریری بانکپن اور نثری اسلوب کا رنگ و آہنگ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے، مثلاً لالہ وگل میں شامل مضامین کی اشاعت کا آپنے ارادہ کیا تو ''خامہ فرسائی'' کے عنوان کے تحت یوں رقم طراز ہوئے ''کہاں گئے دوست احباب؟ کس دنیا کے باسی ہیں شفیق ماں باپ؟ یہ عورت کا سہاگ کس نے لوٹا؟ یہ شوہر کی خانہ ویرانی کس نے کی؟ یہ بچے کیوں یتیم ہو گئے؟ یہ شاد آباد گھرانہ آج ماتم کدہ ہے؟ کیا کہہ گیا اور کیسی سچی بات وہی اردو کا مشہور شاعر جس نے عروج کے بعد زوال دیکھا، جسے امارت کے بعد فلاکت نے گھیرا یعنی ان شاء اللہ خاں انشاء ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب تیار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

آہ! غفلتوں کا پشتارہ اس پر خدا تعالیٰ کی جانب سے انتباہ و ایقاظ، حالانکہ عبرت پذیر دل و دماغ نے ہر لمحے کی آمد و رفت کو بھی درس عبرت قرار دیا ؎

غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور گھٹادی

پھر آگے لکھتے ہیں:

''اپنے بزرگوں، اپنے اکابر، جانی پہچانی شخصیتوں اور متعارف افراد و اشخاص پر یہ مضامین قلم بند ہوئے، خدا جانے کن کن مجلّات و جرائد کیلئے اور کہاں کہاں کے اخبارات و رسائل میں شاید قدرت انہیں محفوظ رکھنا چاہتی ہے کہ عزیز قلبی خادم زادہ مولوی احمد خضر سلمہ

کو خیال ہوا کہ جمع ترتیب کے بعد ان کی طباعت کا سروسامان ہو کارساز حقیقی کی چارہ سازیاں کہ طویل وسنگلاخ مراحل سے گذر کر اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے"۔

لالہ وگل میں جن شخصیات پر طبع آزمائی کی گئی ہے ان میں سے بعض کے نام آپ کے خطوط پھر ان کے جوابات جو مکتوب الیہ کی جانب سے وارد ہوئے، مندرج ہیں ان خطوط کا پس منظر بھی شامل کتاب ہے جس کے تعلق سے آپ لکھتے ہیں:

"ہر مکتوب کے پس منظر کو لانے کے لئے قلم گھسنے کی ضرورت تھی سو وہ اس کم سواد نے انجام دی، مہم تو سر نہ ہو سکی لیکن کچا چٹھا آپ کے روبرو ہے، نگاہ خوردہ گیر سے بھی پناہ مانگتا ہوں اور مبالغہ آمیز مدح سے بھی اگر یہ مجموعہ قابل قبول ہے تو رحمت رحمان کا ادنیٰ کرشمہ قرار دے کر داد کا رخ بے تکلف احمد خضر کی طرف کیجئے، ناپسندیدہ ہے تو گردن زدنی میں ہوں" (لالہ وگل ص ۱۴)۔

شاہ جی کی حالات حاضرہ پر گہری نگاہ رہتی وہ مسلمانوں پر دشمنان اسلام کے تابڑ توڑ دینی علمی مذہبی فکری اور عسکری حملوں سے نہ صرف کڑھتے بلکہ تاریخ اسلام اور صحابہ کرام کے عہد میمون سے وافی شافی اس کا تحلیل وتجزیہ فرماتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں "اس صدی کا مسلمان مشرق میں ہو یا مغرب میں جنوب میں یا شمال میں زندگی کے جن نازک مرحلوں سے گذر رہا ہے اس طرح کہ شوکت وطاقت سے بھی محروم ہے اقتصادی ومعاشی الجھنوں میں بھی گرفتار اور سیاسی اقتدار سے بھی بہت دور، ان حالات میں اسلام کی ان چند شخصیتوں کے عبرت انگیز حالات اور کوائف ہی سننے اور سنائے جانے کی چیز ہے۔ کیا عجب ہے کہ امت کی موجودہ نسل اپنے رجال واشخاص کی زندگی کو نمونہ بنا کر روشنی کے ان مناروں سے اپنے ٹمٹماتے ہوئے چراغ روشن کر سکے"۔

آپ کا قلم وزبان اسلام کا ترجمان تھا وہ دفاع عن الدین کے بارے میں بیحد حساس

تھے۔ مغرب کی جانب سے جو تمدنی اور فکری یورشیں مشرقی ایوانوں پر ہو رہی تھیں اس سے آپ رنج والم محسوس کرتے اور اس پر قدغن لگانے سے دریغ نہ فرماتے، چنانچہ آگے تحریر فرماتے ہیں:

''امریکہ کی تقلید، یورپ کا فکر، کمیونزم کے تخیلات، امپریلزم کے افکار اور سوشل نظریات وغیرہ ذلتوں کے گڈھوں میں کھینچ کر لیجانے والے تو ہیں لیکن قعر مذلت سے نکلنے اور نکالنے کا کام ان سے نہیں لیا جا سکتا، خاک نشینوں کو خاک سے کاخ تک پہنچانے کا ذریعہ وہ تعلیمات ہیں جن کا سرچشمہ قرآن وحدیث میں اور جس کے سوتے عمل بالقرآن اور عمل بالسنۃ سے نکلتے ہیں، آج بھی انہیں حقائق پر عمل کرنے والے یہ کہتے ہوئے منزل کی طرف بڑی تیز گامی سے چلے جا رہے ہیں کہ ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا'' (لالہ وگل ص ۱۶)۔

شاہ صاحب کی تحریروں کے کئی زاویے ہوتے ہیں جو سب کے سب مکمل اور قابل رشک، جہاں ان کا صوتی رنگ و آہنگ غضب کا ہوتا ہے وہیں ان کا پیرایہ بیان بھی دلچسپ، وہ الفاظ بھی خوب لاتے ہیں مگر معنویت کا حقیقی رشتہ بھی ختم ہونے نہیں دیتے، جس کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے لگایئے جو صاحب ترجمان السنہ حضرت مولانا بدر عالم میرٹھی پر ہے:

''نیرنگی ہائے قدرت کہ نوح کے یہاں کنعان آزر کے یہاں ابراہیم وجود پذیر ہوئے اور عجیب وغریب روایات بطور یادگار وسرمایۂ عبرت اپنے پیچھے چھوڑیں مشہور ہندی شاعر ''اقبال'' کو فخر تھا اور اسی فخر نے ان سے کہلایا ؎

مرا بنگر کہ در ہندوستان دیگر نمی بینی برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است

اس میں یہ اور اضافہ کر لیجئے، کہ پورا گھرانہ مغربی تعلیم سے آراستہ، کوئی کلکٹر، کوئی ڈپٹی کلکٹر، کوئی تھانیدار لیکن مخرج الحی من المیت نے انہیں ''اموات'' میں ایک جیتی جاگتی ہستی بھی پیدا کر دی۔ دنیا سے چلے اور دین تک جا پہنچے، فرنگیت کے غبار سے دامن

جھاڑا اور پھر زمزم سے ہمیشہ کیلئے اسے دھوڈالا اور ایسا نچوڑا کہ فرنگیت کے آثار باقی نہ رہے۔ زہد وتقویٰ کی دھوپ میں اسے سکھایا، جسم زیبا پر لیا تو اس کی زیبائی میں اور اضافہ ہوا، سرخ وسپید چہرہ، منور آنکھیں، اس پر تابدار چشمہ، سر پر بالعموم رومال، نزاکت میں تانا شاہ، نفاست میں واجد علی، حدت مزاج ایسی کہ ڈگری کبھی کم نہ ہوتی۔ (لالہ وگل ص ۱۳۴)

خانوادۂ قاسمی کے روشن چراغ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا تعارف بالکل ان کے مناسب حال یوں کراتے ہیں:

''خانوادۂ قاسمی کے گوہر شب چراغ، چمنستان قاسمی کے گل سبد، سحر البیان مقرر وواعظ، ہزار داستان نکتہ آفریں، نکتہ شناس، پرانی روایات کے حامل لیکن جدت سے بھی نفور نہیں بلکہ قدیم وجدید کے سنگم، ایسے دریا جس میں ہر طرح کی ندیاں آکر گھل مل جائیں، خوش رو بلکہ مغل شاہزادوں کی طرح خوب رو خوش پوشاک، قامت ایسا زیبا کہ ہر لباس ان کے بدن پر بہار دیتا، روئی کے گالے کی طرح سفید بڑی آنکھیں جن پر دبیز پلکوں نے خوشنما سائبان کی شکل اختیار کی تھی، چہرہ پر معصومیت کا نور، خلوت اور جلوت میں فرشتوں کے ہجوم میں رہتے، جس مجلس میں پہنچتے صدر نشیں، جس محفل میں در آتے تو مسند آرا، حلم وتحمل، صبر وضبط پوری زندگی پر حاوی، عفو ودرگزر زندگی کے ہر شعبہ ومنزل میں نمایاں، ساٹھ سال سے زائد دارالعلوم کا اہتمام کیا اور اسے جہاں گیر بنایا، شرق وغرب کے سفر کئے اور دارالعلوم کی آفاقیت کے پھریرے اڑائے۔ (ص ۱۲۸)

شاہ صاحبؒ ملفوظات حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے بہترین حافظ اور ناقل ہیں کوئی بھی مسئلہ ہو یا کوئی بھی ادق موضوع ان کا ثاقب ذہن فوراً اس کے مالہ وماعلیہ کی تفہیم وتحصیل میں اپنا جوہر کمال دکھاتا ہے یہاں صرف نقلِ ملفوظ کا نمونہ دیکھئے!

''اہل علم جانتے ہیں کہ الجھے ہوئے مسائل میں امام ابوحنیفہؒ آخری فیصلہ مبتلی بہ پر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر حضرت تھانوی تو بلاشبہ فقیہ الامت تھے جن کے فتاویٰ پر آج بھی کروڑوں مسلمان باطمینان خاطر حرام وحلال، جائز وناجائز کے فیصلے قبول کر رہے ہیں مگر آپ ہی کو اک روز نماز کے ختم پر دانتوں میں کچھ خون کا شبہ ہوا تو نماز کی صحت وعدم صحت کے بارے میں اپنی رائے پر اعتماد کے بجائے دو مستند اہل فتویٰ کو دکھا کر نماز کی صحت کا اطمینان حاصل کیا، ان علمائے ربانیین کی یہی شان تھی .... دانت کی تکلیف کے دوران لاہور کے کسی معالج نے دانت میں سونے کے استعمال کی تجویز کی، حضرت کو اس میں کچھ الجھن تھی تو باضابطہ دارالعلوم کے دارالافتاء سے استفتا فرمایا اس وقت کے مسند نشیں اہتمام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب وحضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے تھانہ بھون حاضر ہوکر عرض کیا کہ آپ خود فقیہ الامت ہیں آپ کے ہوتے ہوئے ہم اس پر کیا لکھیں فرمایا کہ ''یہ میری ذاتی الجھن ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے لئے سہولت کی راہ نکال لوں'' اگر مقالے کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو اس طرح کے احتیاط کے واقعات آپ کی سوانح سے بکثرت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ (ص ۴۹)

زیر قلم شخصیت پر جب آپ خامہ فرسائی کرتے ہیں تو حقیقت نگاری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا، تعارف بھی تعریف بھی اور تنقیح بھی، مگر سوال نہیں کہ منفی تنقید کا کوئی بھی عنصر درآیا ہو دیکھئے یہ نمونہ:

''قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے پوتے، دارالعلوم دیوبند کے فاضل، حاذق طبیب اور گوشہ نشین دانشور، لباس وپوشاک نفیس، گفتگو نستعلیق، ان کی اردو عرب کے صحرا سے اس طرح گذری کہ اردو برائے نام اور عربی کا غلبہ تمام، حافظہ بے نظیر، مضامین مستحضر، بولنے پر آتے تو بے تکان بولتے چلے جاتے، ناز میں پلے ہوئے، نیاز

مندی سے بہت دور، مرزا مظہر جان جاناںؒ نے لکھا ہے کہ نازک مزاجی لازم صاحبزادہ گیست'' مرزا مرحوم کے اس قول کی تصدیق حکیم صاحب کو دیکھ کر کرنا پڑتی ہے، مشہور مقولہ ہے کہ بیوی اور خادم کسی کے معتقد نہیں ہوتے، خاکسار کی جانب سے اس میں صاحبزادوں کا بھی اضافہ کرلینا چاہئے لیکن عجیب بات ہے کہ حکیم صاحب کو حضرت شاہ صاحب مرحوم سے بے پناہ عقیدت تھی خاکسار سے فرمایا کہ میں جب دارالعلوم دیوبند میں پڑھتا تھا تو حضرت شاہ صاحبؒ کو ارادتاً پہروں دیکھتا اور یہ سوچتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفتار و گفتار آپ کی نشست و برخاست، قعود و قیام، لباس و پوشاک، انداز کلام و گفتگو اس طرح ہوگا۔ (ص ۲۲۵)

اپنے وطن کشمیر کا تعارف جس طرح شاہ صاحب نے لکھا ہے وہ انہی کا کمال اور حصہ ہے، کشمیر کے تعارف پر یہ ایک البیلی تحریر ہے جو بس پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، پر شوکت الفاظ ہیں، مؤثر و دلکش تعبیرات ہیں، سوز دروں اس پر مزید چنانچہ لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب مرحوم کا وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن و جمال، رعنائی و کشش، جاذبیت و دلکشی شادابی و شادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے جس کی پر حسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہت گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب و ہوا کی خوش گواری، مناظر کا حسن قدیم زمانے سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا، بادشاہوں نے یہاں پر بار عیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیاء اس کے جمال دل افروز میں پا گرفتہ''۔ (ص ۳۶۷)

حضرت شاہ صاحب اپنے والد مرحوم کی شاعری اور ان کی فن کارانہ صلاحیتوں کے اعتراف میں لکھتے ہیں:

''مبداً فیاض شاعر کو ایک نرم و نازک و حساس قلب سے سرفراز فرماتا ہے۔ وہ

اپنے ماحول وگردوپیش سے عام انسان سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے اور پھر اس کا تأثر شعری لب ولہجہ میں ڈھل کر دوسروں کیلئے اثر انگیز واثر آفریں ہوتا ہے۔ محبوب کی بے التفاتی، رقیبوں کی عداوت، پھولوں کا حسن، نسیم سحر کی نزاکت، کہساروں کی رفعت، پانی کی اچھل کود یہ اور سب چیزیں شاعر پر ایک اثر چھوڑتی ہیں، اسی طرح وہ کسی کی موت کی شدت کو بھی محسوس کرتا ہے، یہی اثر مرثیہ بن جائے گا اسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے والہانہ تعلق نعت کی طرف متوجہ کرے گا، خدائے تعالیٰ کی صناعی اور اس کے انعامات کی بارش حمد کا روپ دھارے گی، کسی شخص کے کارنامے دامن دل کو کھینچیں گے تو وہی قصیدہ بن جائے گا، غرضیکہ غزل ہو یا نظم، مسدس ہو یا رباعی، قطعات ہوں یا مخمس ہر ایک کا پس منظر شاعر کو اپنے تاثرات وانفعالات کے اظہار پر مجبور کر دیتا ہے۔۔۔ حضرت شاہ صاحب ہوں یا علمائے ربانی ان کے قصیدے کرم طرازیوں یا امراء کی عنایتوں کا مظہر نہیں ہوں گے یہ کام تو قاآنی وخاقانی کا ہے" (نقش دوام ۲۶۲/ ۲۶۳)

ختام مسک کے طور پر بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ شاہ صاحب شگفتہ تحریر وانشاء کے طرح دار تھے۔ نقش دوام کا ہر ورق اور اس کی ہر سطر علم وکمال کے خزانہ سے مملو ہے، وہ اپنی تحریر کے بانکپن میں عظمتوں کا طواف کرتے نظر آتے ہیں، لالہ وگل ہو یا نقش دوام ایک مرتبہ شروع کردیجئے بس پھر مطالعہ کا انہماک بڑھتا ہی جاتا ہے، قاری کے سامنے ان کی نثری ادائیں اس طرح رقص کناں ہوتی ہیں کہ وہ بھی ان کی زلفوں کا اسیر ہوکر مچلنے لگتا ہے، اس کیلئے بسا اوقات یہ فیصلہ بھی کار دشوار ہوتا ہے کہ وہ واقعات کو مستحضر کرے یا شاہ صاحب کے اسلوب نگارش کو اپنے خانۂ دل میں آباد کرے، آخر کونسا موضوع ہوگا جس پر شاہ صاحب نے اپنے تیز گام قلم کو حرکت نہ دی ہو ان کی خدماتِ علم وقلم کا ایک وسیع جہان

آباد ہے، جہاں شاہ صاحب اپنی ساحرانہ صحافت اور دل ربا نثری شناخت کے ساتھ تادیر زندہ رہیں گے اور ان کے معارف و مآثر کی شام دیر اور بہت دیر سے آئے گی۔

(بہ شکریہ ماہنامہ محدث عصر دیوبند)

ترجمانِ حق اور سلف کی مثالی یادگار

حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومیؒ

علم وادب، فکر وتحقیق، شعر وسخن اور فقہ وفتاوی کے باب میں خوش گوار اور قابل قدر اضافہ کرنے والے ترجمان حق حضرت مولانا مفتی عبدالقدوس رومی علیہ الرحمہ بھی آخرت کو سدھار گئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ان کے سانحہ ارتحال سے علمی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی اور ان کے حادثۂ وفات کو ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا، بالخصوص اسلئے بھی کہ وہ سلف کی آخری نشانی اور دارالعلوم ومظاہر علوم کی علمی وتحقیقی روایتوں کے نقیب تھے، ہندو پاک کے نابغۂ روزگار اہل حق علماء میں وہ امتیازی شان رکھتے تھے اور دین ودانش کے باب میں کسی مداہنت یا مجاملت کے روادار قطعاً نہ تھے، کئی آزمائشی مرحلے آئے جب اچھے اچھے بھی خاموش یا مصلحت کے اسیر نظر آئے، لیکن حضرت مفتی صاحب کو اللہ رب العزت نے حق گوئی وبے باکی کا خوب خوب ملکہ عطا کیا تھا، اس لئے وہ کہیں بھی رجعت قہقری کے شکار نہیں ہوئے، صاف گوئی میں وہ اہل حرم کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اور جس موقف پر ڈٹ جاتے ٹس سے مس نہیں ہوتے تھے، اس کے لئے انہیں کسی بھی